الکلام

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نیوز میگزین

Al kalam

نومبر 2014 شمارہ XIX

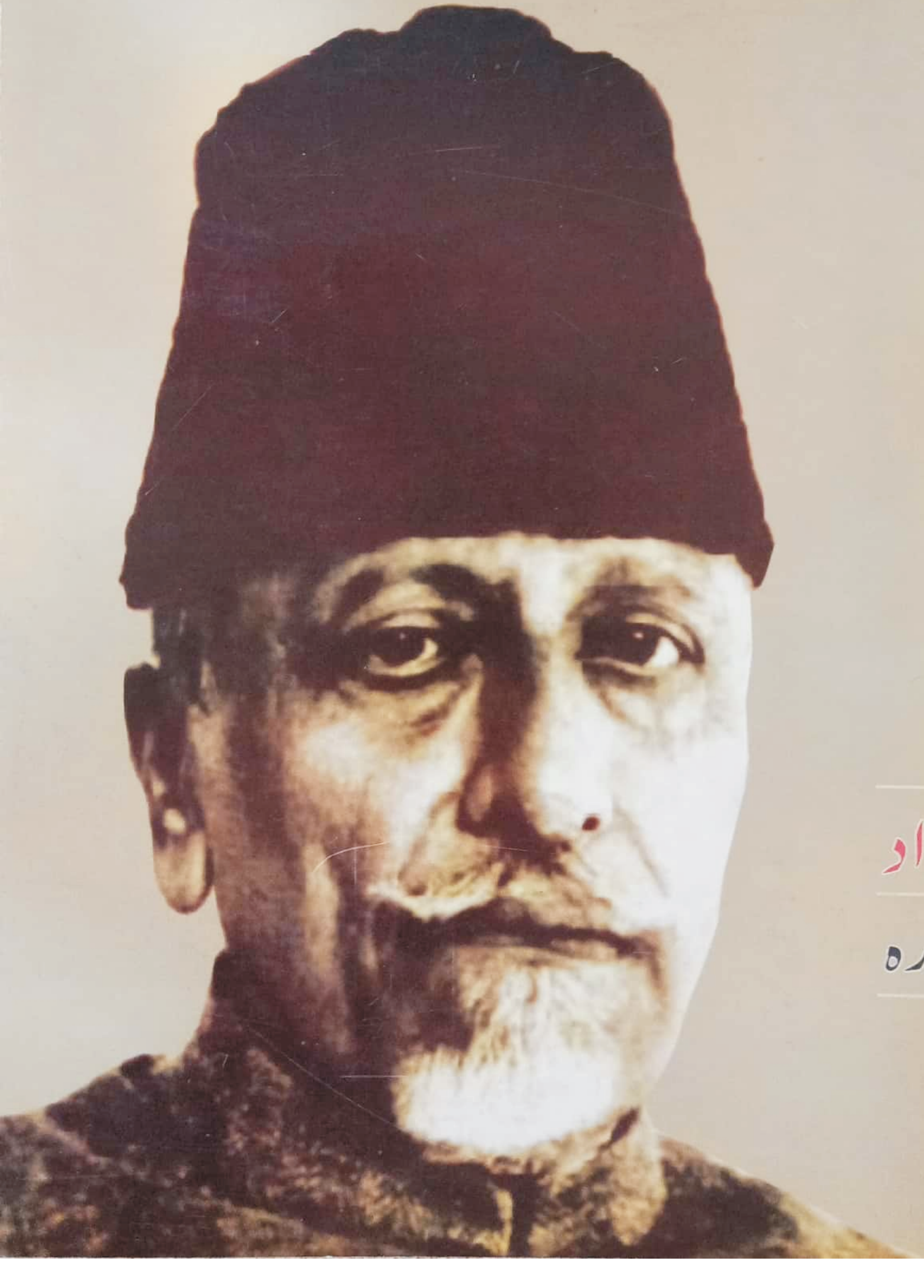

مولانا آزاد

خصوصی شمارہ

Scanned with CamScanner

مولانا ابوالکلام آزاد چیئر

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے 2008 میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

میں مولانا ابوالکلام آزاد چیئر کے قیام کی منظوری دی۔

مولانا آزاد چیئر نے 12-2011 میں اپنی کارکردگی کا آغاز کیا۔

میدانِ عمل

مولانا آزاد اور صحافت

تعلیم بالخصوص اعلیٰ تعلیم کے شعبے میں مولانا کی خدمات

ہندوستان میں اردو اور عربی ادب کے فروغ میں مولانا آزاد کا حصہ

تحریک آزادی میں مولانا آزاد کے کردار کے سیاسی/سماجی/تاریخی پہلو

مولانا آزاد کے حوالہ سے بین مذہبی تقابلی مطالعہ

سیکولرزم اور شمولیاتی تعلیم سے متعلق مولانا آزاد کے نظریات

مولانا آزاد کے اقدار

◇◇◇

الکلام - مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میگزین
شمارہ 19 ۔ نومبر 2014
پبلک ریلیشنز آفس، گچی باؤلی، حیدرآباد، 032 500، ریاست تلنگانہ
فونو فیکس 040-23006606
ویب سائٹ: www.manuu.ac.in
e-mail: editornewsmagazine@gmail.com, manuupro@gmail.com

سرپرست: پروفیسر محمد میاں، وائس چانسلر

ایڈیٹر انچیف: ڈاکٹر خواجہ محمد شاہد، پرووائس چانسلر

ادارتی پینل

آمنہ کشور — میر ایوب علی خان

عابد عبدالواسع — شمس عمران

پرنٹر اینڈ پبلشر: پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ، رجسٹرار

اردو یونیورسٹی کا اعلیٰ معیار ہی مولانا آزاد کو حقیقی خراج

پروفیسر محمد میاں

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت میں بچپن ہی سے غیر معمولی اوصاف و اطوار نمایاں تھے۔ جدید تعلیمی نظام سے انہوں نے راست استفادہ نہیں کیا تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم کا اہتمام گھر پر کیا گیا۔ مولانا کے والد مولانا خیرالدین کا تعلق کولکتہ کے ایک مشائخ گھرانے سے تھا، جن کے مریدوں کی خاصی تعداد تھی۔ وہ ایک عالمِ دین بھی تھے۔ انہوں نے مولانا آزاد کو عربی، فارسی اور اردو میں ابتدائی تعلیم سے آراستہ کیا۔ مولانا نے بعد میں انگریزی سیکھی۔ مولانا نے جب کم عمری میں نثر و نظم نگاری کا آغاز کیا تو قارئین کو ان کی تحریروں پر کسی پختہ قلم کار گمان ہونے لگا۔ کچھ لوگ تو یہ تک سمجھنے لگے کہ مولانا آزاد کے نام سے کوئی اور بلکہ بہت ممکن ہے کہ انہی کے استاد، اپنی قلم کی جولانیاں بکھیر رہے ہیں۔

مولانا نے اپنے والد سے بہت کچھ سیکھا لیکن پیری مریدی کی روایت سے اجتناب کیا۔ وہ اپنا راستہ خود بنانے پر یقین رکھتے تھے۔ ان کا ذہن ہر طرح کے شکوک و شبہات کی آماجگاہ بن گیا۔ مولانا نے کچھ عرصہ کے لیے برطانوی حکمرانوں کے خلاف ہندوستان میں انقلابیوں کا بھی ساتھ دیا۔ عرب دنیا بالخصوص مصر میں برپا قوم پرستانہ تحریکوں اور ان سے ہونے والی تبدیلیوں پر مولانا کی گہری نظر تھی۔ ان کی تحریروں میں اس کے آثار نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ انہوں نے بالآخر قرآن مجید اور سنت نبویؐ ہی کو اپنی رہنمائی کا مرکز و محور تسلیم کرلیا۔

مولانا نے محسوس کیا کہ مسلمان، ہندوستان کی تحریک آزادی میں پوری طرح شامل نہیں ہیں۔ ان کے بیشتر ہم مذہبوں کا ماننا تھا کہ برطانوی حکمرانی کا جاری رہنا ہی ان کے مفاد میں ہے۔ لیکن مولانا اس تصور کو ایک فاش غلطی مانتے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو پوری طاقت کے ساتھ تحریک آزادی میں شامل ہونے کے لیے جھنجھوڑا۔ انہوں نے اپنے اخبار الہلال کے ذریعہ مسلمانوں کو دوٹوک انداز میں بتادیا کہ برطانوی سامراج سے آزادی کا حصول دیگر ابنائے وطن کے لیے ہوسکتا ہے کہ ایک قومی ذمہ داری ہے لیکن مسلمانوں کے لیے تو یہ مذہبی فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا آزاد کا رابطہ موہن داس کرم چند گاندھی سے جب 1920ء میں ہوا تو دونوں نے ساتھ مل کر کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ خلافت تحریک کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان غیر معمولی اتحاد کے مظاہرے کا یہی راز تھا۔

مولانا 1923ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی صدارت پر فائز ہوئے تب ان کی عمر صرف 35 برس تھی۔ 1940ء کی پر آشوب دہائی میں انہیں پارٹی کی قیادت کا بار دوسری مرتبہ سونپا گیا۔ دوقومی نظریہ کے خلاف ان کے سخت گیر اور غیر متزلزل موقف نے انہیں ایک ایسا ستارہ بنادیا جو ہندوستان کے افق پر ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ مولانا کو خود اپنی برادری کے متعدد قائدین سے تنقیدوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کے باوجود وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ انہیں ہندوستان کو متحد رکھنے کی اپنی غیر مفاہمانہ دلی آرزو کی پاداش میں کئی بار قید و بند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔

مہاتما گاندھی، مولانا آزاد کی بصیرت اور تدبر سے اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے مولانا کو شہنشاہِ علم اور افلاطون، ارسطو اور فیثا غورث کا ہم پلہ فلسفی قرار دیا۔ مولانا کو ہندوستانی اکتساب کے اصولوں کی مکمل سمجھ تھی اور وہ دنیا میں ہندوستان کو ایک ترقی یافتہ قوم بنانے کے لیے درکار تمام تقاضوں سے بخوبی آشنا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عبوری حکومت میں انہیں ملک کا پہلا وزیر تعلیم مقرر کیا گیا اور 1947ء میں آزادی کے بعد بھی وہ اس عہدہ پر فائز رہے۔

مولانا آزاد کی شخصیت ہمہ پہلو اور غیر معمولی شخصیت سے ہمیں کئی درس ملتے ہیں۔ ایک ایسے تعلیمی نظام کی طاقتور بنیاد جس کے ثمرات سے ہم آج بھی مستفید ہو رہے ہیں، ان کا ایک نمایاں کارنامہ ہے۔ حکومت ہند نے اس غیر معمولی شخصیت کی یاد میں کئی اداروں کو ان سے موسوم یا قائم کیا ہے۔ مولانا آزاد سے موسوم اور قوم سے منسوب ایک تحفہ جو تبدیلی کے نقیب کے طور پر اپنی شناخت بنا رہا ہے، وہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ہے۔

اردو یونیورسٹی 1998ء میں پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے ذریعہ قائم کی گئی۔ دو باتیں اسے دیگر تمام جامعات سے ممیز و ممتاز کرتی ہیں۔ اول تو یہ کہ اسے اُس زبان میں تعلیم کی فراہمی کا موقع دیا گیا ہے، جو مولانا آزاد کی زبان تھی، یعنی اردو۔ مولانا نے اپنے دور میں اسی زبان کے سہارے مسلمانوں کی ذہن سازی کی تھی۔ انہوں نے مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو اور سردار پٹیل جیسی قد آور شخصیتوں کے ساتھ مل کر ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی قیادت بھی اسی زبان کے ذریعہ انجام دی۔ اردو صحافت اور انشاء پردازی میں نئے اسلوب و انداز کو متعارف کرنے کا سہرا بھی مولانا آزاد کے سر ہے۔ اردو، ہندوستان اور بیرون ملک کروڑہا افراد کی مادری زبان ہے۔ یونیورسٹی کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اسے سارے ملک پر محیط دائرۂ کار عطا کیا گیا ہے اور وہ فاصلاتی تعلیم اور روایتی تعلیم دونوں طرز کو اختیار کیے ہوئے ہے۔ یونیورسٹی نے روایتی مضامین کے علاوہ انجینئرنگ، ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر سائنس و نیز بزنس مینجمنٹ جیسے عصری مضامین میں تعلیم کا آغاز کردیا ہے۔ یونیورسٹی بالخصوص ایسے افراد پر اپنی توجہ مرکوز کر رہی ہے جو کسی وجہ سے اسکول یا کالج نہیں جا پاتے۔ مختلف سماجی اور معاشی اسباب کے نتیجہ میں خواتین، اکتساب اور تعلیم کے میدان میں بسا اوقات پیچھے رہ جاتی ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اس جانب بھی خصوصی توجہ دے رہی ہے اور یونیورسٹی، سماج کے ایسے طبقات تک رسائی میں کامیاب ہوئی ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں ہمارا یہ ماننا ہے کہ ایک طویل سفر اور مقصد عظیم کے حصول کی سمت میں یہ محض ایک آغاز ہے۔ اس چیلنج نے مانو برادری کو اسے نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں ایک باوقار دانشگاہ میں تبدیل کرنے کے لیے پرعزم کردیا ہے۔ اردو یونیورسٹی کا اعلیٰ معیار ہی مولانا آزاد کو سچا خراج ہوگا۔

مسلمانوں کے لئے ملک کی جدوجہدِ آزادی میں حصہ لینا ایک دینی فریضہ-مولانا آزاد

ایس ایم رحمت اللہ

مولانا ابو الکلام آزاد کی شخصیت ہمہ جہت صلاحیتوں کی حامل ہے۔ وہ عالم دین بھی تھے اور مدبر بھی، مفسر قرآن بھی تھے اور مفکر بھی، بیباک صحافی بھی تھے اور شاعر و صاحب طرز ادیب بھی، صف اول کے سیاست داں بھی تھے اور بے مثال مقرر بھی، مکتوب نگار بھی تھے اور انشا پرداز بھی اور مجاہد آزادی بھی تھے اور وزیر تعلیم بھی۔ مزید یہ کہ لسانیات، اصطلاحات، ترجمہ، سائنس و جغرافیہ، منطق و فلسفہ، حدیث و فقہ، قیادت و سیاست اور تعلیم و ثقافت وغیرہ جیسے مستعدد میدانوں میں انہوں نے مقام امتیاز حاصل کیا تھا۔ مولانا آزاد کی اس طرح کی ہمہ گیر شخصیت کا احاطہ کرنا اور اس کی نمایاں خصوصیات کو ضبط تحریر میں لانا یقیناً جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

ہم یہاں صرف مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت اور تحریک آزادی میں ان کی کلیدی کردار کے بارے میں مختصراً گفتگو کریں گے۔

مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت اور تحریک آزادی میں ان کے رول کا جائزہ لینے سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ مولانا کو کن وجوہات کی بنا پر عملی سیاست میں حصہ لینے کی ترغیب ملی۔ تین ایسی وجوہات ہیں جن کی بنا پر مولانا نے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔

پہلی وجہ انگریزی حکومت کا تقسیم بنگال کا فیصلہ تھا۔ مولانا تقسیم بنگال کے مخالف تھے۔

دوسری وجہ مولانا کا مصر، شام، ترکی وغیرہ جیسے ملکوں کا دورہ تھا جہاں پر ان کی ملاقات چند انقلابی قائدین سے ہوئی اور جن کی تحریک سے وہ بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ ان کو ہندوستان کی جنگ آزادی میں حصہ لینا چاہئے اور مسلمانانِ ہند کو تحریک آزادی میں پوری طرح شامل ہونے کی ترغیب دینی چاہئے۔

تیسری وجہ انکا عالم دین اور مفکر ہونا تھا۔ جس کی بدولت وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ طلب آزادی دراصل شرعی تقاضہ اور فرضِ دینی ہے۔ جس کی تکمیل کے لئے ملک کی سیاست میں نمایاں حصہ لینا چاہئے۔

مذکورہ وجوہات سے مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت بھی واضح ہوتی ہے۔ اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ مولانا آزاد میں سماجی ذمہ داری کا جذبہ موجود تھا اور ان میں یہ احساس بھی تھا کہ وہ مسلمانان ہند کو تحریک آزادی کے معاملہ میں کسی سے کم دیکھنا نہیں چاہتے تھے اور وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ہندوستان جلد سے جلد آزاد ہو جائے۔

مولانا کی سیرت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ ان میں بڑا جوش اور ولولہ تھا اور اگر وہ کوئی فیصلہ کر لیتے تو ہر حالت میں اسی پر برقرار رہتے تھے۔ مولانا نے جس وقت ہندوستانی سیاست میں دلچسپی لینے کا فیصلہ کیا اس وقت ان کی عمر بمشکل سولہ سترہ سال تھی۔ وہ اپنے فیصلہ پر برقرار رہے اور تاعمر سیاست سے کنارہ کشی اختیار نہ کی۔ مولانا آزادی کی ہر تحریک میں شامل رہے۔ تحریک ترک موالات، تحریک ہندوستان چھوڑو، قانون نمک کے خلاف تحریک، دوسری جنگ عظیم کے دوران انگریزوں سے عدم تعاون کی تحریک، غرض کہ ہندوستان کی آزادی کی تمام تحریکوں میں مولانا آزاد پیش پیش رہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر کی حیثیت سے بھی مولانا آزاد نے تحریکِ آزادی میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے 1923 اور 1940 میں دو مرتبہ مولانا آزاد کا انتخاب عمل میں آیا تھا۔ انگریزوں کے خلاف ہندوستان چھوڑ دو تحریک کی قرارداد کی منظوری دراصل مولانا آزاد کی صدارت میں ہی بتاریخ 18 اگست 1942ء ہوئی تھی۔ تحریک آزادی میں سرگرم حصہ لینے کی وجہ سے مولانا نے کافی مصیبتیں جھیلیں تھیں۔ حکومت بنگال نے مولانا کو مارچ 1916ء میں ریاست بدر کیا تھا۔ دوسری کئی ریاستوں نے بھی ان کے داخلہ پر امتناع عائد کیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ کلکتہ سے نکل کر رانچی میں مارچ 1916ء تک نظر بند رہے۔ انگریز سرکار نے کئی مرتبہ مولانا کو گرفتار کیا اور محروس رکھا۔ مولانا کی جملہ محروی کی مدت کوئی دس سال پر محیط ہے۔

مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت کا ایک اور اہم پہلو یہ بھی ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ حصول آزادی کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد قائم ہو اور مسلماں قومی سیاست میں عملی طور پر حصہ لیں۔ مولانا کی عملی سیاست کا ایک اور نمایاں پہلو یہ تھا کہ وہ الہلال اور البلاغ کے ذریعہ مسلمانوں کو قومی تحریک میں شرکت کی دعوت دے رہے تھے۔ وہ قرآن کی روشنی میں مذہب اور سیاست میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ مسلمان بڑھ چڑھ کر ہندوستانی سیاست اور قومی تحریک کا حصہ بنیں۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون بعنوان ''ہندوستان کی آزادی اور مسلمان'' میں مسلمانوں سے مخاطب ہوتے ہوئے لکھا ہے:

''دوسروں کے لئے ملک کی آزادی کی جدوجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے۔ مگر آپ کے لئے ایک فرض دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ''

مولانا آزاد سرسید احمد خان کی تحریروں سے کافی متاثر تھے لیکن ان کی

Scanned with CamScanner

مسلمانوں کے سیاست سے دور رہنے کی پالیسی کی انہوں نے الہلال کے ذریعہ مخالفت کی۔ مولانا نے مذہب کا سہارا لیتے ہوئے یہ نظریہ پیش کیا کہ اسلام آزادی کا علمبردار ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے مذہب کی تعلیم پر عمل کرتے ہوئے دوسری قوموں کے ساتھ مل کر آزادی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ مولانا کا انداز کامیاب ثابت ہوا اور الہلال نے مسلم سیاست کا رخ بدل دیا۔ کل تک جو کانگریس سے دور تھے وہ جوق در جوق کانگریس میں شامل ہونے لگے۔

جدوجہد آزادی سے متعلق مولانا آزاد کا ایک اور عظیم کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے تحریک خلافت اور تحریک آزادی کو ایک پلیٹ فارم پر لاتے ہوئے گاندھی جی، لوکمانیہ تلک اور دیگر کانگریسی قائدین کے علاوہ سماج کے اکثریتی طبقہ کی تائید تحریک خلافت کے حق میں حاصل کی اور مسلمانوں کی تائید تحریک آزادی کے حق میں حاصل کرتے ہوئے انہیں قومی سیاست میں عملی طور پر شامل کیا۔ اس طرح مولانا نے ملک کے دو بڑے فرقوں کو انگریزوں کی استبدادی قوت کا مقابلہ کرنے کے لئے متحد کیا۔ یہ ان کا ایک عظیم کارنامہ تھا۔

تحریک آزادی میں مولانا کی شرکت کا اگر اہم بانور جائزہ لیں تو چند ایک واقعات سے ان کی سیاسی بصیرت بھی واضح ہوتی ہے۔ مولانا کے تحریک آزادی کے جذبہ میں دو اہم خصوصیات کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ایک جانب ان کا جذبہ حیت سے پُر تھا تو دوسری جانب اس میں بے باکی بھی تھی۔ تحریک آزادی میں شمولیت کے نتیجہ میں جب ان کو نظر بند کیا گیا تھا اُس وقت ان کی بیگم کا کلکتہ میں انتقال ہوا تھا۔ اس وقت وہ احمد نگر کے قلعہ میں نظر بند تھے۔ جیلر کی جانب سے ان کو اس بات کا اشارہ ملا کہ اگر وہ انگریز حکومت سے درخواست کریں تو ان کو ان کی شریک حیات کے آخری دیدار کے لئے جانے کی اجازت مل سکتی ہے۔ مولانا آزاد کا تحریک آزادی کا جذبہ اتنا غیرت مند تھا کہ انہوں نے ایسے حالات میں بھی انگریزوں سے درخواست نہیں کی۔ مولانا آزاد نے قلعہ احمد نگر میں محروسی کے دوران حبیب الرحمٰن خان شیروانی کے نام چند خطوط لکھے اور ان کو محفوظ رکھا۔ رہائی کے بعد ان ہی خطوط کا مجموعہ ''غبار خاطر'' کے نام سے شائع ہوا۔ ان خطوط سے بھی مولانا آزاد کی ادبی و سیاسی بصیرت کی عکاسی ہوتی ہے۔ رہی بات مولانا آزاد کے جذبۂ جدوجہد آزادی میں موجود بے باکی، کی تو، اس کا ثبوت ہم کو ''قول فیصل'' میں ملتا ہے۔ مولانا آزاد کو بتاریخ 10 دسمبر 1921ء ایک سال کے لئے گرفتار کیا گیا تھا۔ اس گرفتاری کے مقدمہ کی پیشی میں مولانا نے جج کے سامنے جو تحریری بیان دیا تھا وہ قول فیصل کہلاتا ہے۔ اس بیان میں مولانا آزاد لکھتے ہیں:

> ''میں مسلسل بارہ سال سے اپنی قوم و ملک کو آزادی وحق طلبی کی تعلیم دے رہا ہوں۔ میری 18 برس کی عمر تھی جب میں نے اس رہ میں تحریر و تقریر شروع کی۔''

مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت اور عملی سیاست کا ایک اور عظیم پہلو، ان کا تصور قومیت ہے۔ مولانا کے ذہن میں متحدہ قومیت کا تصور تھا۔ انہوں نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی تھی کہ برطانوی حکومت اپنے ذاتی مفاد کے لئے منظم طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت پیدا کر رہی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ آزادی کی راہ کا یہ سب سے بڑا روڑہ ہے۔ وہ برصغیر کے دو بڑے فرقوں 'ہندو مسلم' کے اتحاد کو ترقی کا ضامن مانتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے ہندوستان کی متحدہ قومیت کو قائم رکھنے اور فروغ دینے کے لئے اپنی تمام تر ذہنی، علمی اور استدلالی صلاحیتیں صرف کر دیں۔

مولانا آزاد نے 1921ء کی آگرہ صوبائی خلافت کانفرنس کے اپنے خطبہ صدارت میں کہا تھا:

> ''ہندوستان کی نجات کے لئے...... ہندو مسلم اتحاد ضروری ہے۔ یہ میرا عقیدہ ہے جس کا اعلان 1912ء کے 'الہلال' کے پہلے نمبر میں کر چکا ہوں۔...... ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض شرعی ہے کہ ہندوستان کے ہندوؤں سے کامل سچائی کے ساتھ عہد و محبت کا پیمان باندھ لیں اور ان کے ساتھ مل کر ایک نیشن ہو جائیں۔''

مولانا آزاد ملک کی تقسیم کے خلاف تھے وہ عجلت میں ملک کی آزادی حاصل کرنے پر ہندو مسلم اتحاد کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ اسلامی قومیت کے نظریہ کے تحت مسلم لیگ کی جانب سے پیش کردہ دو قومی تصور کے خلاف تھے۔ ملک کی تقسیم سے حاصل ہونے والی آزادی انہیں کبھی قبول نہیں تھی۔ اس ضمن میں ان کا ایک قول کافی مشہور ہے۔ انہوں نے کہا تھا:

> ''آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بلندیوں سے اتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑا ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج چوبیس گھنٹوں کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان، ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا۔ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوگی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا۔ لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہوگا۔''

ذاکر حسین، پروفیسر ہمایوں کبیر، مالک رام وغیرہ نے تصور قومیت کو سراہا ہے۔ لیکن ملک کے حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ مولانا کو بادل نخواستہ ملک کی تقسیم کو تسلیم کرنا پڑا۔

مولانا آزاد کی قومی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مہاتما گاندھی نے کہا تھا:

''مولانا، انڈین نیشنل کانگریس کے سردار ہیں اور ہندوستانی سیاست کا مطالعہ کرنے والے ہر شخص کو چاہئے کہ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرے۔''

ایس ایم رحمت اللہ
شعبۂ نظم و نسق عامہ میں پروفیسر اور رجسٹرار ہیں۔

فاطمہ بیگم

مولانا آزاد نے بنیادی تعلیم کی مستحکم بنیاد رکھی

مولانا ابوالکلام آزاد ایک جید عالم، قابل سیاستداں، وسیع النظر رہنما اور ایک دور اندیش وزیر تعلیم تھے۔ آج کا ہمارا قومی تعلیمی نظام ان ہی کی دوربین فراست کا رہین منت ہے۔

جس وقت مولانا آزاد نے وزارت تعلیم کا قلمدان سنبھالا تھا اس وقت ملک کی حالت بالعموم اور تعلیمی حالت بالخصوص ناگفتہ بہ تھی۔

آزادی کے وقت ہندوستان میں خواندگی کی شرح 14.7 فیصد تھی۔

اس تعلیمی پسماندگی کی وجوہات ہمارے ملک کی قدیم سماجی اور بعد ازاں سیاسی حالات میں پائی جاتی ہیں۔ انگریزوں کے 150 سالہ دورِ حکومت میں تعلیمی شعبہ بری طرح متاثر ہوا تھا۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی تعلیمی پالیسی ہندوستانی عوام کے حق میں نہیں تھی۔ اگر انھوں نے کچھ کیا بھی تو وہ محض ہندوستان میں ہندوستانیوں کی ایک ایسی جماعت کو تیار کرنے کے مقصد سے کیا جو گوشت پوست اور لہو میں تو ہندوستانی ہو لیکن فکر اور رہن سہن میں انگریز۔، اور جو انگریزوں اور ہندوستانی عوام کے درمیان ایک رابطہ کا ذریعہ بن سکیں (میکالے 1835)۔ بقول مولانا آزاد اس پالیسی نے نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت کو تیار کر دیا تھا جن کی سوچ و فکر مصنوعی اور رہن سہن سب کچھ مصنوعی ہو گیا تھا۔ وہ ہندوستانی تہذیب و تمدن سے دور مغربیت کے دلدادہ ہو گئے تھے۔

مولانا آزاد نے ملک کی تعمیر نو کے ضمن میں مختلف منصوبہ جات اور اسکیمات میں حرکیاتی کردار ادا کیا تھا۔ لیکن بطور وزیر تعلیم انھوں نے جس دور اندیشی کے ساتھ پروگرام وضع کئے تھے وہ ہمارے آج کے قومی تعلیمی نظام میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ خواہ وہ مفت و لازمی ابتدائی تعلیم ہو، تعلیم نسواں ہو یا پھر تعلیم بالغان۔ اسکے علاوہ سائنسی و تکنیکی تعلیم، فنی تعلیم، فنون لطیفہ، صنعتی تعلیم اور سائنسی و ایگریکلچرل ریسرچ اور سوشیل سائنس ریسرچ ہر میدان میں انھوں نے خصوصی توجہ دی اور ان علوم کے فروغ کے لئے اعلیٰ اداروں کا قیام عمل میں لایا۔ ان کا اولین مقصد نو آزاد ملک کے عوام کی بنیادی ضروریات کی تکمیل تھا اور دوسری طرف ان علوم کے فروغ کے ذریعہ ملک کے ترقیاتی اہداف کا حصول جس سے ملک دنیا کے ترقی پذیر ممالک کی فہرست میں شامل ہو سکے۔

مولانا آزاد نے نہ صرف ملک کی مادی ترقی پر توجہ مبذول کی بلکہ افراد کی ذاتی ترقی پر بھی اُن کی خصوصی توجہ رہی۔ اُنہوں نے بچوں اور بالغوں کے لئے عام تعلیم اور فنی تعلیم کے علاوہ فنونِ لطیفہ کی تعلیم کو بھی اہم قرار دیا تا کہ افراد کی شخصیت کی ہمہ جہت نشوونما ہو سکے۔ اسکے لئے اُنہوں نے ہر اسکول میں ضروری مضامین کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تفریحی سرگرمیوں کے اہتمام پر بھی زور دیا جن میں کھیل' ڈانس' ڈرامہ' پینٹنگ اور میوزک شامل ہیں۔ مولانا آزاد نے خود بھی باضابطہ ستار بجانے کی تربیت حاصل کی تھی۔ یہ امر مولانا آزاد کے ایک عالم باعمل ہونے کا ثبوت ہے۔

مولانا آزاد نے بچوں میں اخلاقی اقدار کے فروغ اور بہتر کردار سازی کے لئے ابتدائی تعلیمی سطح پر مذہبی تعلیمات کی اہمیت پر بھی زور دیا۔ چونکہ ہمارے ملک میں کئی مذاہب کے ماننے والے پائے جاتے ہیں اسلئے اُنہوں نے اس معاملے میں مواد کے انتخاب میں کافی احتیاط برتنے کی بات بھی کہی تھی۔ اسی طرح اُنہوں نے بڑھتے بچوں کی شخصیت کی ہمہ جہت نشوونما کے سلسلے میں دستکاری اور فنی تعلیم کی بھی اہمیت پر زور دیا۔ اُن کے مطابق ایک صحتمند اور متوازن سماج کی تشکیل کے لئے اُس میں بسنے والے عوام میں فنون کی قدرشناسی کی تربیت ضروری ہوتی ہے۔ اور اس قسم کی تربیت کے لئے اُنہوں نے نرسری تا اعلیٰ تعلیمی سطح کے لئے مختلف سرگرمیوں کی بھی نشان دہی کی تھی' جو نہ صرف بچوں کی تخلیقی صلاحیتوں کے اُجاگر کرنے میں کارآمد ہوتے ہیں بلکہ اُن میں پائی جانے والی توانائی کو بھی صحیح سمت عطا کرتے ہیں جو دیگر حالات میں محض تخریبی سرگرمیوں میں صرف ہو جاتی ہے۔

مولانا آزاد نے ابتدائی تعلیم کو مستحکم بنانے میں تعلیم بالغاں کے کردار کو اہم قرار دیا۔ کیونکہ مستقبل کی نسلوں کی تعلیم کی منصوبہ بندی اُسی وقت ممکن ہوتی ہے جب کسی بھی زمانے کی موجودہ نسل اُس قسم کی تعلیم کی اہمیت کو سمجھتی ہو۔ وہ مختلف ایشیائی ممالک میں خواندگی کا اپنے ملک کی شرح خواندگی سے تقابل کرتے ہوئے کافی فکر مند تھے۔ 1946 کی مردم شماری کے مطابق جاپان میں کل خواندگی کی شرح 99 فیصد' فلپائین 52.6 فیصد اور اسی طرح چین' برما اور تھائی لینڈ وغیرہ میں بھی حالات ہندوستان کے مقابلے میں کافی بہتر تھے۔ اِنہیں حالات کے پیش نظر مولانا آزاد نے تعلیم بالغاں کے لئے سماجی تعلیم (Social Education) کا تصور پیش کیا۔ ایک ایسی تعلیم جو انسان کے وجود کی تکمیل کرتی ہو' ایسی تعلیم جو اُسے دنیا میں ہونے والے واقعات سے واقف رکھے' ایسی تعلیم جو اُسے اپنے ماحول میں ہم آہنگی سے رہنا سکھائے اور جو اُسے کچھ ایسی دستکاری کا ہنر دے جس سے وہ اپنی معاشی حالت بہتر بنا سکے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس تعلیم کے ذریعہ ملک کے عوام میں اپنی صحت و تندروستی اور حفظان صحت کا بھی شعور بیدار ہو۔ ان سب سے اعلیٰ تر اس تعلیم کا مقصد عوام کو ایک جمہوری ملک میں اپنی ذمہ داری نبھانے کے لائق بنانا ہے۔

Scanned with CamScanner

مولانا آزاد نے اُسوقت ملک کے معاشی حالات کے ناسازگار ہونے کے باوجود کسی بھی پروگرام کو ملتوی نہیں کیا۔ اُنہوں نے ہر مشکل کا کوئی نہ کوئی فوری حل نکال ہی لیا جسے آج کی بول چال میں ''کوئیک فکس'' کہا جاتا ہے۔ ابتدائی تعلیم اور تعلیم بالغاں / سماجی تعلیم کے معاملے میں بھی اساتذہ کی کمی اور عمارتوں کی قلت کا حل یہ نکالا کہ جو بھی عمارتیں ابتدائی تعلیم کے لئے مہیا ہوں اُنہیں میں دن کے مختلف اوقات میں مختلف تعلیمی پروگرام چلائے جائیں۔ اس طرح ایک ہی عمارت کو بیسک ایجوکیشن' نائٹ اسکول اور سنڈے اسکول کے لئے استعمال کیا جائے۔ اساتذہ کے انتظام کے لئے اُنہوں نے بیسک اسکول کے اساتذہ کے علاوہ سرکاری ملازمین سے اپیل کی کہ وہ رضاکارانہ طور پر یا جو بھی معاوضہ مہیا ہو ان تعلیمی مراکز میں اپنی خدمات انجام دیں۔

مولانا آزاد نے تعلیم نسواں کی اہمیت کے سلسلے میں کہا کہ سارے تعلیمی پروگراموں کی کامیابی کا دارومدار تعلیم یافتہ خواتین پر ہوتا ہے۔ اُن کے مطابق ''اگر عورتیں تعلیم یافتہ ہو گئیں تو ہمارے آدھے سے زیادہ مسائل حل ہو جائینگے''۔ (مولانا آزاد - پریس کانفرنس 31 مئی 1948) کیونکہ تعلیم یافتہ مائیں تعلیم کی اہمیت کو سمجھیں گی اور اپنے بچوں کو تعلیم یافتہ بنانے میں معاون ثابت ہونگی۔

مولانا آزاد نے چاہا تھا کہ مستقبل کے ہندوستان میں ایسے مرد و خواتین ہوں جن میں 'ویژن' ہمت اور مقصد کے حصول میں ایمانداری ہو اور جو ہر میدان میں ملک کے کاموں میں اپنا کردار نبھا سکیں ان کے مطابق اسکول وہ تجربہ گاہیں ہوتی ہیں جو مستقبل کے شہریوں کو پیدا کرتی ہیں اور کسی ملک کا معیار ان تجربہ گاہوں کے معیار پر منحصر ہوتا ہے۔

مولانا آزاد نے تعلیم کے ملک گیر پھیلاؤ کے لئے مندرجہ ذیل پروگرام پیش کیا تھا۔

(a) اسکولی عمر کے تمام بچوں کو لازمی بنیادی تعلیم
(b) ناخواندہ بالغوں کے لئے سماجی تعلیم
(c) ثانوی اور اعلیٰ تعلیمی سہولتوں کے معیار میں سدھار اور وسعت
(d) ملک کی ضروریات کے مطابق تکنیکی اور سائنسی تعلیم
(e) فنون لطیفہ اور تفریحی سہولتوں کی فراہمی کے ذریعہ معاشرہ کی ثقافتی زندگی کو بہترین بنانا۔

مولانا آزاد نے ابتدائی تعلیم کو ہر ترقی کا اولین زینہ قرار دیا۔ اُنہوں نے ابتدائی تعلیم کو بنیادی حق کی حیثیت دینے کی بات اُسی وقت رکھی تھی جب آزاد ہندوستان کے لئے دستور تیار ہو رہا تھا۔ انھوں نے اپنے ایک خطبہ میں کہا تھا کہ ''ہمیں یہ کسی لمحہ نہیں بھولنا چاہئے کہ کم از کم اس بات کو یقینی بنانا ہوگا کہ بنیادی تعلیم حاصل کرنا ہر فرد کا پیدائشی حق ہے جس کے بغیر وہ بطور ایک شہری اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتا''۔

اسی طرح ایک اور موقع پر انہوں نے کہا کہ ''قومی حکومت کا کام سب کیلئے لازمی اور رہنمایانہ اصول تعلیم مہیا کرنا ہے''

دستور ہند میں اسے بنیادی حقوق میں تو نہیں رکھا گیا تھا البتہ Directive Principles کے تحت آرٹیکل 45 کے ذریعہ یہ تیقن دیا گیا تھا کہ حکومت اس دستور کے عمل آور ہونے کے بعد دس سال کے عرصہ میں تمام بچوں کو چودہ سال کی عمر تک مفت اور لازمی تعلیم مہیا کریگی۔ لیکن اس کے 36 سال تک بھی اس ہدف کو حاصل نہیں کیا جا سکا۔ اور جب 1986 میں قومی تعلیمی پالیسی کی تشکیل عمل میں آئی تو اس میں بھی ان الفاظ میں اس بات کا اعادہ کیا گیا کہ ''اکیسویں صدی میں داخل ہونے سے پہلے یہ بات یقینی بنائی جائے گی کہ چودہ سال تک کی عمر کے بچوں کو اطمینان بخش، معیاری، مفت اور لازمی تعلیم مہیا کی جائے گی''۔

اس کے نتیجہ میں کئی اسکیمیں اور پروگرام شروع کئے گئے جن میں آپریشن بلیک بورڈ، غیر رسمی تعلیم، مہیلا سمکھیا، ریاستوں کے مخصوص بنیادی تعلیمی پراجیکٹس جیسے آندھرا پردیش پرائمری ایجوکیشن پراجکٹ (APPEP)، بہار ایجوکیشن پراجکٹ (BEP)، لوک جنبش پراجکٹ (LJP) راجستھان، اتر پردیش میں ایجوکیشن فار آل پراجکٹ، شکشا کرمی پراجکٹ راجستھان (SKP)، ڈسٹرکٹ پرائمری ایجوکیشن پراجکٹ (DPEP) اور اسی طرح نیشنل پروگرام آف نیوٹریشن سپورٹ فار پرائمری ایجوکیشن وغیرہ۔ بیسویں صدی کے اواخر میں ان سارے پروگراموں کے جاری ہونے کے باوجود عام ابتدائی تعلیم (UEE) کا ہدف حاصل نہ ہو سکا یعنی ملک کی تمام آبادیوں میں اسکولی عمر کے بچوں کا اسکول میں صدفی صد داخلہ اور داخلہ کے بعد صدفی صد ابتدائی تعلیم کی تکمیل ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے حکومت ہند نے اکیسویں صدی کے پہلے دہے میں سروا شکشا ابھیان کی اسکیم کو ''تعلیم سب کے لئے'' کے نعرہ کے ساتھ شروع کیا اور

اس کے ذریعہ 2010ء تک ابتدائی تعلیم کے ہدف کو حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس پروگرام کے ساتھ ایک اور قومی پروگرام نیشنل پروگرام آف نیوٹریشن سپورٹ فار پرائمری ایجوکیشن جو مڈڈے میل کے نام سے جانا جاتا ہے شامل کر لیا گیا تا کہ بچوں کے داخلہ اور حاضری میں اضافہ ہو سکے. سروا شکشا ابھیان کی جڑیں دراصل ڈسٹرکٹ پرائمری ایجوکیشن پراجکٹ (DPEP) میں ہی پائی جاتی ہیں جو 1994-1993 میں جاری ہوا تھا۔

ان تمام کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ 2011 کی مردم شماری کے مطابق خواندگی کی شرح دس سال کے عرصہ (2001 تا 2011) میں 9.21 فیصد کا اضافہ ہوا اور یہ 64.8 فیصد سے بڑھ کر 74.04 فیصد ہو گئی اور کل ملا کر 1947 سے 2011 تک چونسٹھ سال کے عرصہ میں خواندگی کی شرح 14.7 فیصد سے بڑھ کر 74.04 فیصد تک ہو گئی۔

مولانا آزاد نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لئے مادری زبان یا علاقائی زبان کو ہی بہترین ذریعہ قرار دیا۔ انہوں نے نہ صرف مادری زبان اور ہندوستانی زبانوں اور ثقافت کے فروغ پر زور دیا بلکہ اسکے ساتھ ساتھ انہوں نے انگریزی زبان اور مغربی ممالک کے علوم وفنون سے واقفیت کو بھی اتنا ہی اہم قرار دیا۔ انہوں نے اس خطرہ سے بھی آگاہ کیا کہ جس طرح ہندوستانی نوجوان تعلیم یافتہ ہو کر اپنی تہذیب وتمدن اور ورثہ کو بالائے طاق رکھ کر، انگریزی زبان اور مغربی تہذیب کے دلدادہ ہو گئے تھے اب کہیں ایسا نہ ہو کہ قومی تحریک کے دھارے میں بہہ کر خود کو ایک ایسے 'پنجرے' میں قید کر لیں جہاں مغربی علوم وادب پہنچ نہ پائیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہم مادی املاک کو تو مہر بند کر کے رکھ سکتے ہیں۔ لیکن علم اور تہذیب کو قومی اور جغرافیائی سرحدوں میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ یہ قومیت سے بالاتر ہوتی ہیں۔ ان کا مبداء دنیا کے کسی بھی علاقے میں ہوتا ہے۔ لیکن یہ عالم انسانیت اور تمام ممالک کی مشترکہ میراث ہوتے ہیں۔ مولانا آزاد کے اس بیان سے globalisation کا تصور عیاں ہوتا ہے۔ اور ان کی یہ فکر کہ ہندوستانی نوجوان کسی بھی معاملہ میں دنیا میں پیچھے نہ رہیں۔

تعلیم کو ایک بنیادی حق کے طور پر شامل کرنے کی سفارش پہلی بار 1990ء میں آچاریہ راما مورتی کمیشن نے کی تھی۔ اُسی سال ہندوستان نے تعلیم کے سلسلے میں منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس ''ایجوکیشن فار آل'' میں حصہ لیا تھا۔ اور پھر ہندوستان میں تعلیم کی اس سمت میں کوشش بین الاقوامی توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔

1992 میں سپریم کورٹ نے حق تعلیم کو بنیادی حق کی حیثیت سے شناخت دی۔ ''حق زندگی'' (آرٹیکل 21) اور کسی فرد کے وقار کو اس وقت تک یقینی نہیں بنایا جا سکتا جب تک کہ اسکے ساتھ حق تعلم بھی شامل نہ ہو۔ حق زندگی ہی حق تعلیم کا مبداء ہوتا ہے۔ اسی دوران سپریم کورٹ نے انی کرشنن کیس (1993) نے مولانا آزاد کی 45 سال قبل کہی ہوئی بات کا اس طرح اعادہ کیا کہ ''ملک کے ہر بچہ کو چودہ سال کی عمر کے مکمل کرنے تک مفت تعلیم کا حق حاصل ہے''۔

2002 میں آرٹیکل 21-A کو دستور ہند کی 86 ویں ترمیم کے ذریعہ شامل کیا گیا جس میں ابتدائی تعلیم کو ایک بنیادی حق کی حیثیت دی گئی۔ اور اس حق تعلیم کو نافذ العمل ہونے کیلئے ایک قانون کی ضرورت تھی۔ جو قانون حق تعلیم (RTE-Act) نے عطا کی۔ تعلیم کو وہی قانونی حیثیت دی گئی جو ہندوستان کے آئین کے ذریعہ زندگی کے حق کو دی گئی ہے۔ اس طرح تمام بچوں کے لئے 6 تا 14 سال کی عمر تک مفت اور لازمی تعلیم ایک بنیادی حق بن گیا اور اکیم اپریل 2010 کو اس قانون کے نفاذ کے ساتھ ہی ہندوستان دنیا کے اُن 135 ممالک میں شامل ہو گیا جہاں پر تعلیم کو ہر بچہ کا بنیادی حق قرار دیا گیا ہے۔ RTE-Act دنیا میں پہلا قانون ہے جسکے ذریعہ بچوں کے داخلے، حاضری اور تعلیم کی تکمیل کی ذمہ داری حکومت کے سر ہے۔

نہ صرف یہ بلکہ اس ایکٹ کے تحت لائے گئے بنیادی اہتمام کے پیش نظر یہ بعید نہیں کہ ہندوستان اقوام متحدہ کے ملینیم ترقیاتی اہداف کے پرائمری تعلیم کے نشانہ کو حاصل کر لے یعنی 2015ء تک تمام بچے پرائمری سطح کی تعلیم مکمل کر لیں۔ جب یہ نشانہ بھی حاصل ہو جائیگا تو مولانا آزاد کے اپنے وطن کے صدفی صد بچوں کو پرائمری تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کا خواب بھی شرمندۂ تعبیر ہو جائیگا۔

اور اسطرح قانون حق تعلیم کے نفاذ کے ذریعہ مولانا آزاد نے جو بات اپنے خطبات کے ذریعہ عوام تک پہونچائی تھی وہ 62 سال کے عرصہ کے بعد مختلف سیاہ' سنہری اور روپہلی بدلیوں سے گذر کر ہندوستانی نظام تعلیم کے شفق پر قانون حق تعلیم کی شکل میں ایک ایسی لازوال کرن بن کر ابھری ہے جو ہر اندھیرے کو مٹادیگی۔ مولانا آزاد کی آزاد ہندوستان میں تعلیمی نظام کے مختلف پہلوؤں سے متعلق جو فکر اور ویژن تھا وہ رفتہ رفتہ حقیقت کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ انہوں نے تقریباً نصف صدی سے بھی زاید عرصہ قبل منجملہ دیگر ترقیاتی پروگراموں کے تعلیم کے مختلف شعبہ جات کی ترقی وفروغ کے لئے جو قلیل مدتی و طویل مدتی پروگرام وضع کئے تھے ان کی معنویت آج کے دور میں بھی برقرار ہے۔ ان کی فلسفیانہ فکر اور خداداد علمی صلاحیتوں اور عملی حکمت عملیوں کے پیش نظر مہاتما گاندھی نے مولانا آزاد کو افلاطون' ارسطو اور فیثا غورث کا ہم صف قرار دیا تھا اور پنڈت جواہر لال نہرو نے انہیں بجا طور پر ''میرِ کارواں'' کا نام دیا تھا۔

فاطمہ بیگم
ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن اینڈ ٹریننگ میں پروفیسر ہیں

Scanned with CamScanner

محمد فہیم اختر ندوی

تعارف اسلام کی عملی تصویر

مولانا ابوالکلام آزاد (1888-1958) ایک ایسی منفرد شخصیت کے مالک تھے جو اسلام کی تاریخ، ہندوستان کی تاریخ اور مسلمانانِ ہند کی تاریخ کے ساتھ ناقابل فراموش تعلق رکھتی ہے۔ آپ کی زندگی، آپ کی جدوجہد، اور آپ کے کارنامے سب روش عام سے ہٹے ہوئے تھے۔ مولانا نے دینی ماحول میں پرورش پائی، لیکن شعور کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی روایتی اسلام کو خیر باد کہا اور اسلام کے شعوری مطالعہ میں منہمک ہوگئے۔ پھر عمیق مطالعہ وتفکر سے جس اسلام کو دریافت کیا، اسے ہی اپنی فکر وقلم اور زبان وبیان کا موضوع بنایا۔ مولانا آزاد یوں تو دنیا کے متعدد علوم وفنون پر مجتہدانہ بصیرت رکھتے تھے، لیکن ان کے استفادہ کا اصل سرچشمہ کتاب الٰہی یعنی قرآن کریم اور رسول اکرم ﷺ کی سنت وسیرت رہے۔ وہ خود کہتے ہیں: ''ہمارے پاس اگر کچھ ہے تو صرف قرآن ہی ہے، اس کے سوا ہم کچھ اور نہیں جانتے، ساری دنیا کی طرف سے ہماری آنکھیں بند ہیں اور تمام آوازوں سے کان بہرے ہیں، اگر دیکھنے کیلئے روشنی کی ضرورت ہے تو یقین کیجئے کہ ہمارے پاس تو (سراج منیر) کی بخشی ہوئی ایک ہی روشنی ہے، اسے ہٹا دیجئے گا تو بالکل اندھے ہوجائیں گے''۔ کلام الٰہی سے اپنے استفادہ کی نوعیت وہ یوں بتاتے ہیں: ''کامل ستائیس برس سے قرآن میرے شب وروز کے فکر ونظر کا موضوع رہا ہے۔ اس کی ایک ایک سورت، ایک ایک مقام، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں طے کی ہیں اور مرحلوں پر مرحلے طے کئے ہیں''۔ پھر اسی روح قرآنی کو انھوں نے اپنی تحریروں میں سمونے کی کوشش کی۔ اس لئے مولانا آزاد کا مطالعہ اسلام نہ تو روایتی ہے اور نہ وراثتی، بلکہ وہ ایسا شعوری مطالعہ ہے جو شکوک وشبہات کی راہوں سے گذر کر علم اور تحقیق کی منزل سے آشنا ہوتا ہے۔

مولانا آزاد نے اسلام کا تعارف کراتے ہوئے دو اہم نکات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ ایک عالمگیر ہدایت ربانی اور وحدت دین کا موضوع ہے۔ اور دوسرا تبلیغ دین کے تصور کی توضیح ہے۔ پہلے موضوع کی وجہ سے دنیا میں اختلاف پیدا ہوا اور لوگ فرقوں اور گروہوں میں بٹ گئے۔ اور دوسرے موضوع نے اقوام عالم کو ایک دوسرے کا دست وگریباں بنایا، اور مسلمانوں کے اندر فرقہ بندیاں پیدا ہوئیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے واضح کیا ہے کہ دنیا میں مذاہب کا اختلاف غیر فطری ہے، اور وہ دین کی اس وحدت سے گریز ہے جس کی دعوت لے کر تمام انبیاء آتے رہے۔ مولانا کے مطابق خدا کے تمام پیغامبر ایک ہی عالمگیر قانون سعادت کی تعلیم دینے والے تھے۔ اور وہ ایمان وعمل صالح کا قانون تھا۔ لیکن لوگوں نے پھوٹ ڈال کر اصل دین کو پارہ پارہ کردیا اور جدا جدا راہیں نکال لیں۔ مولانا کہتے ہیں کہ خدا کی سچائی سب کے لئے تھی اور سب کو ملی تھی، لیکن سب نے سچائی سے انحراف کیا، سب اصل کے اعتبار سے سچے اور سب عمل کے اعتبار سے جھوٹے ہیں۔ مولانا کے نزدیک پیروان مذاہب کی گمراہی یہ ہے کہ انھوں نے اس اصل حقیقت سے انحراف کیا۔ قرآن سب کو ایک عالمگیر سچائی یعنی خداپرستی اور نیک عمل کے قانون کی طرف لانا چاہتا ہے۔ اور اسی کو وہ دین قرار دے کر 'الاسلام' کے نام سے پکارتا ہے۔ مولانا آزاد بتاتے ہیں کہ جہاں تک دین کی ظاہری شکل وصورت کی بات ہے تو وہ قرآن کی زبان میں شرع ومنہاج ہے جو ہر عہد کے احوال وظروف کے مطابق الگ الگ آتے رہے۔

مولانا آزاد کے اس تصور وحدت دین نے بعض حلقوں میں اس غلط فہمی کو جنم دیا کہ مولانا آزاد وحدت ادیان کے قائل ہیں اور کسی بھی مذہبی روایت سے وابستگی ان کے نزدیک اخروی نجات کے لئے کافی ہے۔ حالانکہ مولانا آزاد اس کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ جب اس بابت مولانا آزاد سے سوالات کئے گئے تو انھوں نے وضاحت کی کہ 'ایمان باللہ میں نہ صرف ایمان بالرسل بلکہ ایمان بالکتب وبالملائکہ وبالیوم الآخر داخل ہے، اس لئے جب کبھی ایمان اور عمل کہا جائے گا تو ایمان سے مقصود یہی ایمان ہوگا، نہ کہ کوئی دوسرا ایمان، اور عمل سے مقصود وہی اعمال ہوں گے جنہیں اس نے عمل صالح قرار دیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ عدم تفریق بین الرسل بھی اس میں داخل ہے، اور کوئی ایمان بالرسل جو تفریق بین الرسل کے ساتھ ہو، قرآن کے نزدیک ایمان نہیں، وہ کہتا ہے کہ اس زنجیر کی

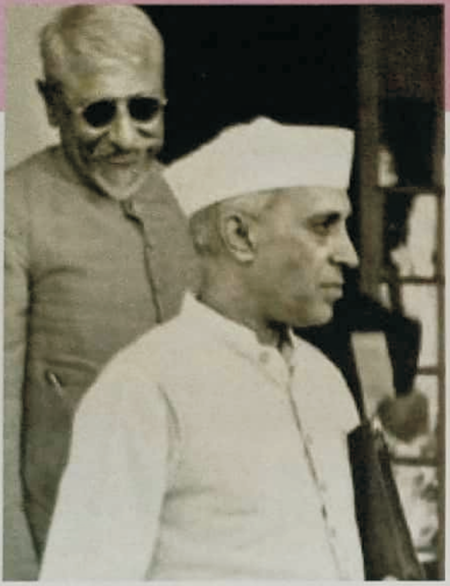

اور وہ تمام پچھلی دعوتوں کا جامع ومشترک خلاصہ ہے، ٹھیک اسی طرح شرع ومنہاج کا معاملہ بھی کامل ہوچکا ہے، اور وہ تمام پچھلے شرائع کے مقاصد وعناصر پر جامع وحاوی ہے۔

اسلام کے تعارف میں مولانا آزاد کے پیش نظر دوسرا نکتہ مذہب کی تبلیغ کے حوالے سے رہا ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا آزاد نے پوری وضاحت کے ساتھ اور مدلل طور پر بتایا کہ دین ومذہب کی صرف تبلیغ ہونی چاہئے، توکیل اور زور زبردستی نہیں۔ اللہ کا حکم صرف تبلیغ کا ہے، توکیل کا نہیں ہے۔ اور تبلیغ وتوکیل میں فرق ہے۔ مولانا آزاد کے مطابق تبلیغ یا تذکیر آزادی فکر واعتقاد کا نام ہے۔ اور توکیل خدائی فوجداری، بے اعتدالی اور انتہا پسندی کا نام ہے۔ قرآن نے یہ حقیقت واضح کردی کہ خدا کے رسولوں کا منصب بھی تذکیر وتبلیغ کے اندر محدود تھا۔ انھیں کسی کو زبردستی منوانے کا حق نہیں دیا گیا تھا۔ لوگوں سے غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے تبلیغ کی جگہ توکیل کا منصب اختیار کرلیا۔ اگر دنیا نے دعوت حق کی یہ روح سمجھ لی ہوتی تو نوع انسانی کی وہ تمام خوں ریزیاں جو فکر وعمل کے اختلاف سے پیدا ہوئیں یک قلم ختم ہوجاتیں۔ مولانا شکوہ سنج ہیں کہ خود مسلمانوں نے بھی قرآن کی یہ تعلیم پس پشت ڈال دی اور ان میں فرقہ بندیاں پیدا ہوگئیں۔ ان کے باہمی انتشار اور اختلاف کا حل یہ ہے کہ وہ توکیل کی راہ چھوڑیں اور تبلیغ یعنی آزادی فکر کی روش اختیار کریں۔

وحدت دین اور تبلیغ دین وفکر کے حوالے سے مولانا آزاد کا یہ تعارف اسلام ہر دور کی طرح آج بھی اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے۔ مولانا جس وحدت انسانی اور اتحاد اسلامی کو برپا دیکھنا چاہتے تھے، ان کو روبہ عمل لانے کے لئے مولانا کا بیان کردہ یہ نسخہ نہ صرف روح اسلام کا صحیح تعارف ہے بلکہ انسانیت اور امت دونوں کے لئے ایک نسخہ کیمیا بھی ہے۔

ڈاکٹر فہیم اختر ندوی

شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے صدر ہیں

محمد فریاد

مولانا آزاد کی انقلابی صحافت: الہلال کے تناظر میں

مولانا آزاد کی صحافت کی شروعات شعری گلدستہ ''نیرنگ عالم'' سے ہوئی اس کے بعد انہوں نے نوبت رائے کے رسالہ ''خدنگ نظر'' میں پہلے مضامین لکھے پھر بحیثیت سب ایڈیٹر کے شریک ہوئے۔ ان کی صحافت کا یہ سفر ''لسان الصدق''، الندوہ''، ''وکیل''، ''الہلال''، ''البلاغ''، ''پیغام'' اور الہلال ثانی (1927) تک چلا۔ اس دوران انہوں نے اردو صحافت پر نئے نئے تجربے کئے۔ ماہرین آزاد مالک رام، ابوسلمان شاہجہاں پوری اور عبدالقوی دسنوی کے مطابق ماہنامہ ''لسان الصدق'' اور ''الندوہ'' جہاں مولانا کی صحافتی تربیت کا درمیانی دور تھا وہیں سہ روزہ ''وکیل'' ان کی صحافتی زندگی کی آخری تربیت گاہ تھی۔ جہاں سے مولانا کی صحافتی اور سیاسی بصیرت پروان چڑھتی ہے۔ مولانا نے 1908 میں ''وکیل'' (امرتسر) سے رخصت لینے کے بعد دو تین برسوں تک ہندوستان کی سیاست کا بغور مشاہدہ کیا اور آئندہ کے لائحہ عمل ترتیب دئے۔ ان ہی دنوں مولانا نے عراق شام، مصر ترکی اور فرانس کا دورہ کیا اور وہاں کے سیاسی حالات کا بڑی باریکی سے مطالعہ کیا۔ اس سفر میں ان کی ملاقات ایسے قائدین اور سیاسی رہنماؤں سے ہوئی جو ترکی کے انقلابی رہنما مصطفےٰ کمال پاشا کے بہت قریب تھے۔ ان لوگوں کے خیالات کا مولانا آزاد پر بہت گہرا اثر ہوا اور آگے سیاست میں قدم رکھنے کا سبب بھی بنا۔ مصر میں ان کی ملاقات جامعہ ازہر کے ممتاز علماء سے بھی ہوئی جن کے علمی اور صحافتی نظریہ نے ان کو کافی متاثر کیا۔ سفر سے واپسی کے بعد تین برس 1909 سے 1912 تک وہ ہندوستان کے سماجی اور سیاسی حالات کا بہت ہی گہرائی سے مطالعہ کرتے رہے اور آئندہ کی سرگرمی کا خاکہ بناتے رہے۔ مولانا آزاد نے محسوس کیا کہ ملک سے انگریزوں کو در بدر کئے بغیر ملک و قوم کی ترقی نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے انہوں نے صحافت کو بطور ہتھیار استعمال کرکے مسلمانوں کے اندر انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے اور اسے ملک بدر کرنے کا جذبہ پیدا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے پیش نظر انہوں نے جرجی زیدان کے ''الہلال'' رشید رضا مصری کے ''المنار'' اور جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کے ''العروۃ'' کو سامنے رکھتے ہوئے ہفت روزہ ''الہلال'' جاری کیا۔ 13 جولائی 1912 کو دنیائے صحافت کے افق پہ ہفت روزہ ''الہلال'' طلوع ہوا۔ جس کی نورانی کرنوں سے برطانوی سامراج کی فرقہ وارانہ ظلمت چھٹنے لگی اور ہندوستان کا کونہ کونہ حب الوطنی کے جذبے سے منور ہو گیا۔ ہندو مسلمان کے درمیان جو فرقہ وارانہ دیوار برٹش حکومت نے کھڑی کی تھی اسے گرانے اور ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے کے لیے مولانا نے اپنا زور قلم جھونک دیا۔ الہلال کی تحریر مولانا کی خون جگر میں ڈوبی ہوئے سیاہی کی عکاسی کرتی ہے۔ جس کا اظہار نومبر 1921 میں اجلاس جمعیۃ العلماء ہند میں اپنے صدارتی خطبہ میں انہوں نے خود بھی کیا ہے۔

''عالم اسلام کے ماضی قریب میں اصلاحِ دینی اور انبعاث علمائے ملت واحیاء وتجدید امت کی جو دعوت ان تمام پچھلی دعوتوں کے طریقوں اور اسلوبوں سے بالکل مختلف اسلوب پر بلند ہوئی ہے، وہ دعوت الہلال کی دین ہے۔ میں نے الہلال مرحوم کو کبھی اپنے چشم خونین کے آنسوؤں سے رنگا ہے اور کبھی اس کے سوادے حروف کے اوپر اپنے دل و جگر کے ٹکڑے بچھا دیے ہیں۔'' (خطبات آزاد، ص 104)

الہلال کی صحافت دراصل تجدید احیائے ملت، اتحاد ملت اور متحدہ قومیت کی تحریک تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کو نہ صرف تحریک آزادی میں شریک ہونے کی دعوت دی بلکہ ان کے لیے اس کو مذہبی فریضہ بھی قرار دیا۔ وہ لکھتے ہیں ''غفلت اور سرشاری کی بہت سی راتیں بسر ہو چکیں اب خدا کے لیے مدہوشی سے سر اٹھا کر دیکھئے کہ آفتاب کہاں سے کہاں نکل آیا آپ کے ہمسفر کہاں تک پہنچ گئے ہیں اور آپ کہاں پڑے ہیں۔ یہ مت سمجھ لیجئے کہ آپ اور کوئی نہیں قوم مسلم ہیں اور اسلام کی آواز آپ سے مطالبات رکھتی ہے۔ یاد رکھئے کہ ملک کی آزادی کے لیے جدو جہد کرنا ہندوؤں کے لیے داخل حب الوطنی مگر آپ کے لیے فرض دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

ہفت روزہ الہلال نے ہندوستان کی صحافتی تکنیک میں جو جدت اور ندرت پیدا کی اس جانب اشارہ کرتے ہوئے عبدالقوی دسنوی لکھتے ہیں کہ ''الہلال لیتھو پریس کے بجائے ٹائپ میں نکالنے میں کامیاب ہوئے تو ان کے قدر دانوں کی حیرت میں مزید اضافہ ہوا۔ شکل و صورت، ترتیب و تزین رنگ و آہنگ کے اعتبار سے یہ ہفتہ وار اس وقت کے تمام اردو جریدوں میں بالکل مختلف تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے الہلال کے ذریعہ اردو صحافت کے بدلتے قالب کو کچھ اس طرح محسوس کیا:

''اس نے اردو صحافت کی جیسے دنیا ہی بدل دی صورت و

سیرت، مغز و قالب سب میں اپنے پیش رو معاصر ہفتہ واروں سے بالکل مختلف اور کہیں زیادہ شاندار و جاندار چھپائی، کاغذ، تصویریں، سب کا معیار اعلی، رنگین سرورق پر ایڈیٹر کا نام یوں درج ہوتا ہے ''احمد المکی ابی الکلام دہلوی'' یہ ''المکی'' کے صحیح تلفظ اور معنی کے لیے صراح و قاموس کی ورق گردانی کرنی پڑی۔ اور ایڈیٹر کہاں اس کی جگہ ''مدیر مسئول'' محرر خصوصی اور رئیس القلم تحریر، جریدہ کی جگہ مجلہ، ولایتی ڈاک کی جگہ ''برید فرنگ'' حیرت انگیز کی جگہ ''محیر العقول'' قسم کے خدا جانے کتنے نئے نئے اور بھاری بھرکم لغات اور نئی ترکیبیں، نئی تشبیہیں نئے استعارے، اور نئے اسلوب و بیان ہر ہفتہ اسی ادبی و علمی ٹکسال سے ڈھل ڈھل کر باہر نکلنے لگے۔ اور جاذبیت کا یہ عالم تھا کہ نکلتے ہی سکہ رائج الوقت بن گئے۔ حالی و شبلی کی سلاست و سادگی سر پیٹتی رہی اور اکبر الہ بادی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق سب ہائے ہائے کرتے رہ گئے۔ (صدق جدید، مارچ 1958، مجلہ آزاد، جلد 2001)

الہلال کا ظاہری حسن وتزین و زیبائش اپنی جگہ لیکن اس کے صفحات پر جو تحریریں نقوش ہوئیں اس نے مسلم معاشرہ اور ہم وطنوں کو تو بیدار کیا ہی ارباب حکومت کی بھی نیند اڑا کر رکھ دی۔ ماہر آزاد مالک رام اس کی تحریر کے اثر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ظاہری حسن اور طباعتی خوبیوں سے قطع نظر الہلال کا اصلی کارنامہ اس کے مدیر شہیر کے طرز تحریر کی بدولت تھی۔ کاہے کو کبھی کسی رسالے کے ایڈیٹر نے اپنے ہم وطنوں کو ارباب حکومت کو، اکابر قوم کو، علمائے دین کو یوں للکارا ہوگا۔ مولانا آزاد نے کسی کو نہیں بخشا۔ اور کوئی بھی ان کی نگاہ احتساب سے باہر نہیں رہا۔۔۔۔ اس وقت ہماری قومی تحریک اس مرحلہ پر تھی کہ دوسروں کا کیا ذکر کانگریس کے سالانہ اجلاس میں بھی سب سے پہلی قرارداد حضور قیصر ہند ملک معظم سے ملک کو قوم کی وفاداری منظور کی جاتی تھی۔ مہاتما گاندھی ہنوز جنوبی افریقہ سے ہندوستان نہیں پہنچے تھے اور پوری سیاسی تحریک بہت ہی نرم رو اور نرم گفتار تھی۔ حکومت پر اور اس کے اعمال واقوال پر کڑی نکتہ چینی کی ابتدا الہلال سے ہوئی۔ (کچھ ابوالکلام کے بارے میں، ص 61)

برٹش حکومت ایک مدت تک الہلال کے خلاف سخت اقدامات کرنے سے گریز کر رہی تھی۔ کیوں کہ یہ ایک نیم مذہبی جریدہ تھا، لیکن وہ موقع کے تلاش میں تھی اور اسے یہ موقع جلد ہی مل گیا۔ الہلال کے 12 اور 17 اکتوبر 1914 کو دو شمارے مشترک شائع ہوئے تھے اس میں دو مضمون پہلی جنگ عظیم میں برطانوی حکومت اور اس کے اتحادیوں کے خلاف اور جرمنی اور اس کے اتحادیوں کے حق میں شائع ہوئے تھے۔ نیز ایک تصویر بھی شائع ہو تھی جس میں برطانوی اتحاد کے بلجیم کے فوجیوں کی لاشوں کو دکھایا گیا تھا اور اس کے نیچے لکھا تھا ''اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں۔ اس اشاعت پر حکومت کے ترجمان ''پائنیر'' (الہ باد سے شائع ہونے والا ایک انگریزی روزنامہ) نے الہلال کے خلاف ایک سخت مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "Pro-Germanism in Calcutta" اس مضمون میں پائنیر نے الہلال کے خلاف سخت چغلی کھائی اور حکومت کے کان بھرے اور کہا کے یہ اخبار (الہلال) جرمنی اتحاد کا ترجمان بنا ہوا ہے۔ حکومت پہلے سے ہی موقع کی تلاش میں تھی۔ اس موقع کو اس نے غنیمت جانتے ہوئے الہلال کے ایڈیٹر سے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی جسے مولانا نے فوری ادا کر دیا۔ لیکن حکومت کی نیت کچھ اور ہی تھی اس لیے اس نے پھر دس ہزار روپے کی ضمانت مانگی جو اس وقت الہلال کے ایڈیٹر کی مالی استطاعت سے بہت زیادہ تھا۔ اس موقع پر الہلال کے کئی قاریوں نے مولانا کو خط لکھ کر مالی امداد دینے کی پیش کش کی۔ لیکن مولانا کی غیرت نے اسے گوارہ نہیں کیا اور 18 نومبر 1914 کو الہلال کا آخری شمارہ شائع ہونے کے ساتھ یہ بند ہو گیا۔ تقریباً ایک سال کی خاموشی کے بعد 12 نومبر 1915 کو مولانا آزاد نے ''البلاغ'' کے نام سے نیا اخبار شائع کیا۔ اس کا صرف نام جدا تھا باقی مقاصد، طرز تحریر، طرز اسلوب، مضامین سب ''الہلال'' والے ہی تھے۔ اس دوران مولانا آزاد سیاست میں بہت زیادہ فعال ہو گئے تھے یہی وجہ ہے کہ ''البلاغ'' نے بہت کم عمر پائی۔ مولانا کی سیاسی سرگرمی سے بنگال حکومت کافی پریشان اور خوف زدہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ''البلاغ'' کی اشاعت کے پانچ ماہ بعد مارچ 1916 میں حکومت نے ڈیفنس آف انڈیا آرڈیننس کے تحت مولانا آزاد کے صوبہ بنگال سے اخراج کا حکم صادر کر دیا جس کے سبب ''البلاغ'' کو بند کرنا پڑا۔ مولانا نے اس کے

Scanned with CamScanner

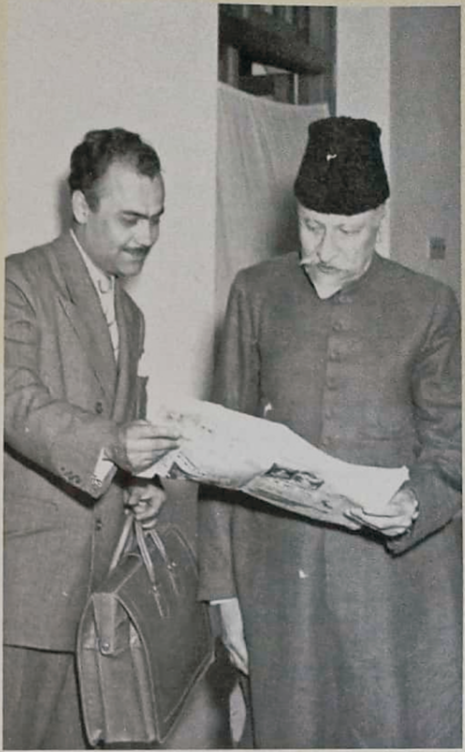

بعد تقریباً چار برس تک رانچی میں نظر بندی کی زندگی گذاری۔ چار برس (20-1916) کی رانچی کی نظر بندی نے انہیں ملک کے تمام حلقوں میں منظور نظر بنا دیا تھا۔ جنوری 1920 کو جب وہ رانچی سے رہا ہوئے تو ہر کوئی ان کے استقبال کے لیے چشم براہ تھا۔ لوگوں کی عقیدتمندی اپنے انتہا پر تھی ۔ یہ زمانہ ہندوستان میں سیاسی انقلابوں اور تحریکوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ مہاتما گاندھی اور علی برادران کی کوشش سے کانگریس اور خلافت تحریک کے اتحاد نے ملک میں سیاسی انقلاب کے شعلے بھڑکا رکھے تھے جس سے حکومت کے حوصلے جھلس رہے تھے۔ انقلابی سیاست کی اس آگ کو مولانا نے سیاست میں شامل ہو کر اور بھی بھڑکا دیا۔ اس کے بعد مولانا پوری طرح سے کانگریس اور قومی سیاست میں مصروف ہو گئے جس کی وجہ سے وہ صحافتی زندگی سے دور ہونے لگے۔ لیکن اب بھی اپنا ایک اخبار شائع کرتے رہنے کی خواہش ماند نہیں پڑی تھی۔ چنانچہ ایک بار پھر سے ''الہلال'' کو جاری کرنے کا فیصلہ کیا اور اس طرح 10 جون 1927 کو الہلال ثانی منظر شہود پر آیا۔ اس میں شائع ہونے والی تحریر کی ترتیب ادارت مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے ہی ذمہ تھی کیوں کہ مولانا سیاست میں بہت زیادہ مصروف تھے۔ اس لیے وہ اس کی ادارت اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہ رہے تھے، لیکن اس کے نگران اور مالک وہی تھے۔ قارئین ان کی تحریر کے دیوانے تھے اور ان کو ان کے تحریر کا بڑی بے صبری سے انتظار رہتا تھا۔ جبکہ سیاست میں بہت زیادہ مصروف ہونے کے سبب مولانا آزد ''الہلال'' ثانی کے لیے بہت کم لکھ پا رہے تھے۔ انہوں نے ملک کی سیاسی تحریک کی قیادت کی اتنی زیادہ ذمہ داری لے رکھی تھی کہ اخبار کے لیے وقت نکالنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ''الہلال'' ثانی بے ترتیبی سے نکل رہا تھا چھ ماہ میں الہلال کے 20 شمارے ہی شائع ہو سکے۔ بالآخر 9 دسمبر 1927 کو ''الہلال'' ثانی اپنے آخری شمارہ کے ساتھ بند ہو گیا اور مولانا آزاد کی صحافتی زندگی سیاسی زندگی میں تبدیل ہو گئی۔ مولانا کے صحافتی سفر کے اختتام کو ماہر آزاد مالک رام نے اردو ادب کا عظیم نقصان گردانا ہے۔

> ''اسے دیکھ کر ایک بار پھر افسوس ہوتا ہے کہ علم و ادب نے ان کی سیاست کی بارگاہ میں کتنی بڑی قربانی دی ہے۔ اگر تمام مشغولیتوں سے قطع نظر کر کے وہ اپنے کو علم و ادب ہی کے لیے وقف رکھتے تو نہ معلوم آج اردو کے خزانے میں کیسے کیسے قیمتی جواہر کا اضافہ ہو گیا ہوتا۔ (کچھ ابوالکلام کے بارے میں، ص، 68)

مولانا آزاد کی صحافت کو ان کے معاصرین اور متاخرین ممتاز صحافیوں اور اہل قلم نے بھرپور خراج عقیدت پیش کی ہے ۔ شورش کاشمیری (مدیر چٹان، پاکستان) نے کہا کہ مولانا آزاد نے اپنی صحافتی زندگی میں کبھی ایسا جملہ یا فقرہ استعمال نہیں کیا جو ذاتیات سے آلودہ ہو۔ ان کا دامن تمام عمر ایسی آلائشوں سے پاک رہا۔ نیا ز فتح پوری (ایڈیٹر ''نگار'') نے کہا کہ ''مولانا آزاد نے الہلال جاری کیا اور اس شان کے ساتھ کہ صحافت کا تمام اگلا پچھلا تصور ہمارے ذہن سے محو ہو گیا اور ہم سوچنے لگے کہ کیا یہ آواز ہماری ہی دنیا کے کسی انسان کی ہے۔'' عبدالقوی دسنوی کہتے ہیں کہ مولانا آزاد کی صحافتی زندگی اور خاص طور سے الہلال کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ صحافت کے لیے ہی پیدا ہوئے تھے لیکن سیاست نے ان سے صحافتی زندگی چھین لی۔

ڈاکٹر محمد فریاد

شعبہ ترسیل عامہ وصحافت میں اسوسیئٹ پروفیسر ہیں

اسکولی طلبہ کا پروگرام

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے زیر اہتمام یوم آزاد تقاریب 2012ء کے ضمن میں نظامت فاصلاتی تعلیم آڈیٹوریم' مانو کیمپس میں ایک رنگا رنگ ثقافتی پروگرام منعقد ہوا۔ صبح 11 بجے منعقدہ اسکولی طلبہ کے اس پروگرام میں 18 سے زائد ہائی اسکولس کے طلباء و طالبات نے حصہ لیا۔ جس میں پیس انجل ہائی اسکول' ایم ایس کری ایٹو ہائی اسکول' ماؤنٹ مری اسکول' مدینہ قرآنک مشن ہائی اسکول' مانو ماڈل اسکول' سیکو نیو ماڈل اسکول' صفدریہ گرلز ہائی اسکول' آئی زیڈ ایم سجادیہ بوائز ہائی اسکول' انوار العلوم ہائی اسکول' دارالشفاء بلائنڈ اسکول' گلینڈیل اکیڈیمی' گرین میڈو پارک ہائی اسکول' گلشن باغ' جامعہ دارالھدیٰ رائل انڈین ہائی اسکول' بی جی آر گورنمنٹ گرلز کالج کے علاوہ مہیتا تنظیم کے تعاون سے بہادر پورہ منڈ کے تین سرکاری اسکول اور بنڈلہ گوڑہ کے ڈریم برڈس کانسپٹ اسکول کے 300 سے زائد طلباء و طالبات نے حمد و نعت و قرأت کلام پاک' نظم' ڈرامہ' قوالی اور ماحولیات کے حوالے سے مختلف النوع دلچسپ پروگرام پیش کیے۔ ثقافتی پروگرام میں حصہ لینے والے سبھی طلباء و طالبات کو اسنادات دیے گئے۔

طلبہ کے ثقافتی پروگرام رنگ ترنگ کا انعقاد

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں یوم آزاد کے موقع پر طلبہ کا ایک ثقافتی پروگرام ''رنگ ترنگ'' منعقد ہوا۔ اس پروگرام کا آغاز سمبل' شاذیہ' گلفشاں اور دیگر کی دعاء سے ہوا۔ اس کے بعد راحت پروین' وینکٹما' سید مصطفیٰ حسین' مسیحا صدیقی' شملا شورین' بلال' صوفیہ خلیل عمر' بابر' سمپت' ہمایوں شیخ' یاسرا' صوفیہ بابر نے نغمے پیش کیے۔ سمبل غزالی' محمد توصیف' محمد ہمایوں شیخ' شکیل اختر نے نظمیں پیش کیں جبکہ شاذیہ نے غزل پیش کی۔ دیپتی نے رقص پیش کیا۔ اس موقع پر ڈرامہ ''ایسا بھی ہوتا ہے'' پیش کیا گیا جس میں محمد توصیف' دیپتی اور طاہر نے کام کیا۔ پروگرام کی نظامت سلمان احمد اور عائشہ بتول نے کی۔

اردو، ہندوستانی مسلمانوں کی پہچان

اردو ہندوستانی مسلمانوں کے تشخص کی پہچان ہے۔ اگر ہندوستان کی گذشتہ 1000 سالہ تاریخ کا مطالعہ کرنا ہو تو اس کے لیے اردو سے بہتر کوئی وسیلہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اُردو میں عربی' فارسی' سنسکرت ہندوستانی زبانوں کی آمیزش ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر شاہ فیصل' آئی اے ایس' جموں و کشمیر و سول سروسز ٹاپر 2009ء نے یوم آزاد و قومی یوم تعلیم کے موقع پر بحیثیت مہمانِ خصوصی خطاب کرتے ہوئے کیا۔ پروفیسر محمد میاں' وائس چانسلر نے صدارت کی۔ ڈاکٹر شاہ فیصل نے جو اُردو زبان اور شاعری کے زبردست پرستار ہیں علامہ اقبال کے کلام کے منتخب اشعار سے مرصع اُردو میں تقریر کی۔ بطور خاص انہوں نے بڑے ہی اچھے انداز میں حضرت ابراہیمؑ کے حوالے سے لکھی گئی علامہ اقبال کی تلمیح کو پیش کیا۔

موسیقی سے لبریز شامِ نغمہ

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی میں یوم آزاد تقاریب 2012ء کے سلسلے کی ایک کڑی روح کو تازگی بخشنے والی صوفی موسیقی اور کلام پر مشتمل ''شامِ نغمہ'' اوپن ایئر آڈیٹوریم میں پیش کیا گیا۔ دہلی کی معروف صوفی گلوکارہ محترمہ ریکھا سوریہ اور ان کی ٹیم نے اپنے مخصوص انداز میں نغمے پیش کیے اور حاضرین سے داد و تحسین حاصل کی۔

Scanned with CamScanner

بیت بازی مقابلوں کا شاندار انعقاد

یونیورسٹی میں یوم آزاد تقاریب کے سلسلے میں بیت بازی کے مقابلوں کا انعقاد عمل میں لایا گیا۔ جس میں مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی پندرہ ٹیموں نے حصہ لیا۔ ہر ایک ٹیم میں تین طلبہ پر مبنی تھی۔ اس مقابلے میں محمد رضا اللہ، محمد حامد اور اے کے امان کی ٹیم کو اول انعام، ابوبکر ابراہیم، ظہیر الدین دانش اور اسد احمد کی ٹیم کو دوم انعام اور محمد شمشاد عالم، زبیر عالم اور ممتاز احمد کی ٹیم کو سوم انعام کا مستحق قرار دیا گیا جبکہ محمد رضا اللہ کو کثرتِ اشعار، ارشد نور کو معیاری اشعار اور عبدالماجد کو بہترین پیشکشی کے لیے خصوصی انعامات کے لیے مستحق قرار دیا گیا۔ پروفیسر خالد سعید، اور ڈاکٹر نسیم الدین فریس نے اس پروگرام کے لیے جج کے فرائض انجام دیے جبکہ ڈاکٹر سید محمود کاظمی، محترمہ بی بی رضا خاتون، جناب مصباح الانظر، جناب امتیاز عالم اور ڈاکٹر اسلم پرویز پروگرام کے کنویزس تھے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے پروگرام کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔

”ترنگ-2013“ کی رونقیں

یونیورسٹی میں یوم آزاد تقاریب کے سلسلے کی کڑی کے تحت اوپن ایر آڈیٹوریم میں تہذیبی پروگرام ”ترنگ-2013“ کا انعقاد عمل میں آیا۔ یونیورسٹی کے مختلف شعبہ جات سے وابستہ طلبہ نے پرو وائس چانسلر ڈاکٹر خواجہ محمد شاہد اور رجسٹرار پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ کی موجودگی میں مہمانوں، ٹیچنگ و نان ٹیچنگ اسٹاف ممبران اور طلباء وطالبات سے کھچا کھچ بھرے آڈیٹوریم میں غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ اس تہذیبی پروگرام میں لوک گیت، ہندی نغمیں، مختصر مزاحیہ ڈرامے، غزلیں اور رقص پیش کیا گیا اور بعد ازاں غیر معمولی کارکردگی دکھانے والے طلباء کو پرو وائس چانسلر نے انعامات سے بھی نوازا۔ انہوں نے طلباء کی کارکردگی پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ طلباء نے مختلف رنگوں سے اس پروگرام میں رنگ بھر دیا۔

انتاکشری - سریلے نغموں کی گونج

”طلبہ کی ہمہ جہت ترقی لیے ثقافتی اور تعلیمی پراگرام بے حد ضروری ہیں۔ ان کے ذریعے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا ملتا ہے اور ان میں کچھ کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ یونیورسٹی انتظامیہ کی خاص طور سے کوشش ہے کہ ایسے پروگراموں کو فروغ دیا جائے جن سے طلبہ کی ذہنی نشو و نما اور شخصیت سازی میں مدد مل سکے۔“ ان خیالات کا اظہار یونیورسٹی کے رجسٹرار پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ نے نظامت فاصلاتی تعلیم کے آڈیٹوریم میں منعقدہ ”انتاکشری“ کے پروگرام میں طلبہ سے خطاب کے دوران کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں 2013 میں منعقدہ یوم آزاد تقاریب کے تحت مختلف تعلیمی وثقافتی پروگراموں کا سلسلہ جاری رہا۔ اس سلسلے میں ”انتاکشری“ کا شاندار انعقاد عمل میں آیا۔ اس موقع پر پروفیسر وہاب قیصر، انچارج ڈائرکٹر آئی ایم سی نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ ڈاکٹر نسیم الدین فریس، اسوسیئٹ پروفیسر اردو اور ڈاکٹر بی بی رضا، اسٹنٹ پروفیسر اُردو نے جج کے فرائض انجام دیے۔ اس مقابلے کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر کرن سنگھ اتوال، اسٹنٹ پروفیسر شعبۂ ہندی اور ڈاکٹر شرت چندر، اسٹنٹ پروفیسر پالی ٹیکنک تھے۔ ان مقابلوں میں طلبہ نے نہایت جوش وخروش کے ساتھ شرکت کی۔ انتاکشری میں جملہ 10 ٹیموں نے حصہ لیا۔ اس مقابلے میں پہلا انعام یاسر احمد، جمیل احمد اور توصیف مجید میر کی ٹیم کو ملا جبکہ دوسرا انعام کا ابو صالح، محمد عامر حسین اور محمد دلشاد احمد اور تیسرا انعام نقیب احمد، محمد عظمت اور غلام رسول کی ٹیم کو حاصل ہوا۔ پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ کے ہاتھوں طلبہ میں انعامات کی تقسیم عمل میں آئی۔

Scanned with CamScanner